محمد حنیف ندوی

# تأثرات

پچھلے دنوں فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے آئین کی ان بنیادوں کی نشان دہی فرمائی تھی کہ جن پر اس کی پوری عمارت استوار ہے۔ چنانچہ آپ نے کہا تھا کہ اصل شئے جو اس سلسلے میں قابل لحاظ ہے، وہ انسانی مصلحت اور انسانی معاشرہ کی فلاح و بہبود کا جذبہ ہے اس کے تقاضے اور مصالح انسانی ہیں۔ رشتہ و تعلق کی کیا نوعیت کارفرما ہے۔ انھوں نے یہ کہہ کر اس کی بھی وضاحت کر دی تھی، کہ "مذہب انسان کے لیے ہے انسان مذہب کے لیے نہیں"، جس سے غالباً ان کا مطلب یہ تھا کہ دین کی تصریحات کی تشریح ایسے انداز سے ہونی چاہیے کہ جو مقتضیات عصر سے قابل عمل ہو اور نوع انسانی کی کامیابی و کامرانی کا ضامن بھی ہو، ایسے اسلوب سے نہیں کہ جس سے یہ دین عقل و تجربے کی محسوس کسوٹیوں پر پورا نہ اتر سکے۔ یا جس سے انسان کی فلاح و بہبود کے اجتماعی تقاضے مجروح ہوتے ہوں۔

صدر مملکت کا یہ ارشاد اپنی جگہ اگرچہ بالکل واضح اور صاف ہے اور مان لینے کے لائق ہے، تاہم اس کا تعلق چونکہ آئین و قانون کی ایک ایسی نازک اساس سے ہے جو صدیوں سے اہل فکر میں متنازعہ فیہ رہی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مضمرات کی مزید وضاحت کی جائے اور تحلیل و تجزیے کے بعد بتایا جائے کہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ہمیں کس حد تک اس کی وسعتوں کو تسلیم کرنا چاہیے اور کن خطرات سے فکر و اجتہاد کی نشاط انگیزیوں کو محفوظ رکھنا چاہیے۔

یہ اصول در اصل سوفسطائیوں کے اس مشہور مقولہ کا پرتو ہے جس کا پہلے پہل پروتاغورس نے یہ کہہ کر اظہار کیا کہ انسان ہی خیر و شر کی تمام اقدار کا پیمانہ ہے اور اس کے بعد یہ حکیمانہ قول اس طرح چل نکلا کہ مابعد کی سوفسطائیت کے قصر دانش کی بنیادی اینٹ قرار پایا۔

سوفسطائیوں کا کیا اشکال تھا اور انسان کو نیکی اور بدی کا معیار ٹھہرا کر وہ کس پیچیدگی کر

سلجھانا چاہتے تھے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے اس کے پس منظر پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا ضروری ہے۔

مسیح سے تقریباً پانچ سو سال قبل یونان میں جو تہذیب رائج تھی اس کی تعمیر میں حصہ لینے والے عناصر میں خصوصیت سے تین چیزوں کو دخل تھا وہ غلط اور مہمل سی روایات تھیں، رسم و رواج کی بیجا اور غیر معقول وہ سختیاں تھیں جو کاہنوں اور پروہتوں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے معاشرہ کا جز بن گئی تھیں۔ اور دیوتاؤں کے وہ متناقض اور پست قصے اور کہانیاں تھیں جن سے خیر و شر کے ایسے پیمانوں کا استنباط ہوتا تھا جو کسی طرح بھی انسان اور معاشرہ میں خیر و فلاح کے ممیزات کو ابھار دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

ان حالات میں سوفسطائی حکماء کا تجویز کردہ صحت مند اخلاقیات کی تخلیق چاہتا تھا، اس کے لیے اس کے معیار کا یہ کہا تھا کہ وہ ان فرسودہ روایات سے ہٹ کر محض نفعیت کی بنا پر خیر و شر کے مسائل کو حل کرے اور بتائے کہ احکام و قوانین کی صحت و استواری کا معیار صرف انسان اور اس کی فلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی ضابطے سے انسانیت کو فائدہ پہنچتا ہے اور معاشرہ کی ضروریات پوری ہوتی ہیں تو وہ صحیح ہے بصورت دیگر نہیں۔

اس اصول کے یہ معنی بھی نکلے کہ اگر قانون اور مصلحت انسانی میں تصادم ہوتا ہو تو قانون کی پروا کیے بغیر مصلحت کا ساتھ دیا جائے آخر میں اس اصول میں خلل پیدا ہوا اور لوگوں نے یہ کہ حیلہ اخلاقی ذمہ داریوں سے خلاصی حاصل کر لینا چاہی کہ ہر انسان کو حق حاصل ہے کہ اپنے مزاج اور نفسیات کے مطابق جس انداز کی اخلاقیات اور مذہب چاہے اختیار کر لے۔

تاریخ کے اس پس منظر میں دیکھیے تو سوفسطائیوں کے اس قول میں وزن معلوم ہوتا ہے لیکن اگر اس پس منظر کو تھوڑی دیر کے لیے تسلیم نہ کیا جائے۔ اور یہ کہا جائے کہ اس اصول اور ان کی مناظرہ پسندی، مغالطیت اور حق کو باطل اور باطل کو حق ثابت کرنے کے ہنر نے استدلال آفرینی نے ختم کر دیا تھا تب بھی اس میں صحت و استواری کا جو پہلو مضمر ہے اس سے قطع نظر ممکن نہیں۔

تاریخ انسان کا یہ جانا پہچانا واقعہ ہے کہ جب بھی کسی قوم نے اپنی تہذیبی روایات کی بنیاد

اندھی تقلید پر رکھی ہے اور زمانہ کی تبدیلیوں اور کروٹوں کا ساتھ نہیں دیا۔ یہ تہذیب اپنی عظمت و قدامت کے باوجود منجمد، بے جان اور بے کیف ہو کر رہ گئی ہے۔

عیسائی دنیا نے سوفسطائیوں کے اس اصول کی روشنی میں اپنے ہاں کی رائج الوقت آئین کا جائزہ لیا ہے۔ اور اس انداز فکر کی شدید مخالفت کی ہے جس کی رو سے اصل اہمیت انسان کے بجائے قانون کو حاصل ہوتی ہے۔ بعض سخنوروں نے اس طرح کے قانون پر کتے کا قانون کی پھبتی کہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مصالح و فوائد سے اغماض کر کے قانون وضع کرنا ہے۔ ایسا طرز عمل جیسا ہم اپنے کتوں کو سدھانے کے لیے اختیار کرتے ہیں یعنی ہم کتوں کو سدھاتے ہیں اور مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی فطرت اور مزاج کے تقاضوں کی پرواہ نہ کریں اور ان عادات اور ضابطوں کی پیروی کا عادی بننے کی کوشش کریں جن کو ہم ان کے لیے وضع کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے قوانین میں خود کتوں کا کوئی فائدہ مدنظر نہیں ہوتا۔

اس اسلوب فکر کے خلاف بینتھم نے پرزور صدائے احتجاج بلند کی اور بتایا کہ صرف انسانی مصلحت و فائدہ کی اساس ہی پر قانون کی تعمیر ہونا چاہیے، قانون و ضابطہ بجائے خود کوئی چیز نہیں۔ اس سے انگریزی آئین میں کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں اس کا ہلکا سا اندازہ اس سے کیجیے کہ جہاں ۱۸۳۲ء سے پہلے دو سو سے زائد جرائم پر سزائے موت دی جاتی تھی وہاں اب صرف دو ہی جرم ایسے رہ گئے جن پر کسی شخص کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ عظمت انسانی کے اس اعتراف اور انسانی معاشرہ کی فلاح کے اس تصور کو آیا ہم اسلام پر بھی منطبق کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ جہاں تک اس کی فقہی و آئینی تشکیل کا تعلق ہے اس میں بہرحال اس اصول کو ملحوظ و مرعی رکھنا چاہیے جیسا اب عقلی تشکیل چاہتا ہے۔

بات یہ ہے کہ اسلام کا موقف پرانی یونانی تہذیب اور عیسائیت سے اصولی طور پر مختلف ہے۔ اس کی بنیاد وحی پر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب اور آنحضرتؐ کے ارشادات پر ہے جن کی

رسم و رواج پر یا فکر و اندیشے کی کاوش و جستجو پر نہیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس میں فکر و اندیشے کی اہمیتوں کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ یا انسانی مفاد اور معاشرہ کی مصلحتوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بلکہ ہمارے ہاں دین کا تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے زندگی کا جو نہج مقرر فرمایا ہے اس میں ہماری تمام ضرورتوں کو بہ احسن وجہ پورا کیا ہے، تمام تقاضوں کی اچھی طرح تکمیل فرمائی ہے اور تمام مصالح اور فوائد کو کامیابی سے سمیٹا اور جمع کیا ہے۔ گویا جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس میں دینی و عقل یا وحی و مصلحت انسانی میں سرے سے کوئی تناقض پایا ہی نہیں جاتا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ وہ نقطۂ اتصال ہے جہاں یہ اصول کہ مذہب انسان کے لیے ہے، اور یہ اصول کہ انسان مذہب کے لیے ہے، کے درمیان قطعی منافات باقی نہیں رہتی۔ یہ صرف ہمارا حسن ظن ہی نہیں واقعہ بھی ہے۔ چنانچہ اصول فقہ میں استحسان اور مصالح مرسلہ ایسے دلائل کا ثبوت ملتا ہے جن کی بنیاد ہی افادیت کے اصولوں پر ہوئی ہے۔

یہ نقطۂ نظر مسئلے کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلام چونکہ تاریخ کے ایسے دور اور ایسی قوم میں نازل ہوا ہے کہ جس میں زندگی ابھی قبائلی حدود سے آگے نہیں بڑھ پائی تھی اس بنا پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے تمام امکانات ارتقا کی پوری پوری تکمیل ہو چکی ہے، اور اب اسے کچھ کرنا نہیں ہے۔ یہ منحصر ہے تفقہ و تدبر پر۔ اور نہ صرف اس لائق ہے کہ زمانے کی تیز رفتاریوں کا ساتھ دے سکے بلکہ اس لائق بھی ہے کہ ہر دور میں افادیت کی اساس پر ایک نئے نظام فقہ کی طرح ڈال سکے۔ اس کے نظام آئین میں ہمیشہ ایسے اجتہاد بے باک کی حاجت رہے گی جس میں پیش آمدہ مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی پوری پوری صلاحیت ہو۔

آخری تنقیح اس سلسلے کی یہ ہے کہ اس کے باوجود کہ اسلام میں اجتہاد کی وسیع گنجائشیں پائی جاتی ہیں اور اس کے باوجود کہ اس میں اندیشہ و فکر کی اہمیتوں کو پوری طرح تسلیم کیا گیا ہے یہ حقیقت ہے کہ فکر و اجتہاد کے لیے کچھ حدود اور کچھ تحدیدات ہیں جن سے تجاوز کسی

صورت میں بھی جائز نہیں ۔ اور یہی وہ نازک مقام ہے جس کو ملحوظ و مرعی رکھنا صد درجہ ضروری ہے مقصد یہ ہے کہ اسلام فرد اور معاشرہ میں جن مقصرات کا اظہار چاہتا ہے اُن کا اظہار قطعی ہونا چاہیے اور تکمیل و اتمام کے جن انفرادی و اجتماعی خانوں میں فکر و اندیشہ کی خدمات کی ضرورت ہے یقینی طور پر ان کو آزمانا چاہیے کہ اس کے بغیر دین بالکل نہس نہس اور بے فائدہ ہو کر رہ جائے گا ۔ مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ وحی و عقل کے جو حدود ہیں وہ قائم رہیں اور اس سے اس کی محسوس اور کھلی ہوئی مصلحتوں کو گزند نہ پہنچنے پائے ۔

---

اس قحط الرجال میں دانش جا سلطان محمد خیال کی اچانک موت ایک زبردست قومی زیاں ہے ۔ مرحوم نے گزشتہ پندرہ ماہ میں جس محنت ، اخلاص اور سلیقے سے کام کیا ہے اس کا سب کو اعتراف ہے ۔ اس سانحے کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ زمام اختیار مرحوم کے بعد ایک ایسے آدمی کے ہاتھ میں آئی تھی جو حسرت اس منصب کے لیے موزوں ترین اور علمی حلقوں میں جانا پہچانا اور متعارف تھا بلکہ جو صحیح معنوں میں علوم و فنون سے دلچسپی رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ ایسے خطوط پر یونیورسٹی کے نظم و نسق کو چلائے جو پارٹی پالیٹکس سے بالاتر ہو اور جس سے اشاعت علم کے عظیم مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ہو سکے ۔ مرحوم کی سب سے بڑی خوبی ان کی سادگی ، اخلاص اور انتھک کام کرنے کا جذبہ تھا اور شاید یہی جذبہ ان کی موت کا سبب بھی بنا ۔۔۔۔ مرحوم ایک پختہ فکر شاعر ، اعلیٰ درجہ کے انسان اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے ۔ اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت کرے اور ان کی محترم بیگم کو توفیق صبر عطا فرمائے ۔ ادارہ ان کے حزن و غم میں برابر کا شریک ہے ۔